پروفیسر رشید احمد

# ابن تیمیہ کے سیاسی افکار

ساتویں صدی ہجری تاریخ اسلام کا تاریک ترین زمانہ ہے۔ اسی صدی میں عباسی خلافت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا۔ جس کے باعث مسلمانوں کی رہی سہی مرکزیت بھی ختم ہو گئی۔ خونخوار تاتاری عذاب الٰہی بن کر عالم اسلام پر چھائے رہے جن کے ہاتھوں متعدد سلطنتیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ کئی ممالک میں انہوں نے بے دریغ کروڑوں بے گناہوں کا خون بہایا۔ اس سیاسی تباہی کا اثر عقائد و اعمال پر پڑنا لازمی تھا۔ مذہب بے شمار توہمات اور لاتعداد بدعات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ قبر پرستی اور پیر پرستی اسلام کے رکن رکین قرار پائے۔ جہاد اور اجتہاد کی حیثیت داستان پارینہ سے زیادہ نہ رہی۔ علماء و فقہا نے مناظروں کی محفلوں میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کو تفقہ فی الدین کا اعلیٰ معیار سمجھ لیا۔ صوفیاء نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھنے کو عین تقویٰ قرار دے لیا۔ پھر فلسفہ کی جانب عوام کے میلان نے حالات کے بدتر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مذہبی احکامات کو فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن و احادیث کی عجیب و غریب تاویلیں کی جانے لگیں۔ تاکہ فلسفیانہ تصورات اور اللہ و رسولؐ کے فرمودات میں مطابقت کی راہ نکالی جا سکے۔ اسلامی اصول میں ایسی ایسی موشگافیاں ہونے لگیں کہ ان کا سمجھنا عوام تو درکنار خواص کے لیے بھی ممکن نہیں رہا۔ اللہ کی سنت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ بگڑے ہوئے حالات میں کوئی مجدد و مصلح پیدا کرتا ہے جو غیر معمولی جرأت و ہمت اور خداداد اولیات و قابلیت سے کام لے کر معاشرے میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیتا ہے اور لوگوں کے عقائد کی اصلاح کر کے ان میں قوت عمل کو ایک بار پھر زندہ کر دیتا ہے۔ بغداد کے زوال کے باعث مسلمان جس سیاسی، مذہبی اور سماجی بدحالی میں مبتلا تھے اس سے نجات دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حران کے مقام پر امام ابن تیمیہ جیسا شخص پیدا کیا جس نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے نہ صرف زبان اور قلم سے جہاد کیا بلکہ شمشیر برہنہ لے کر وہ تاتاریوں کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شام و مصر بھی دیگر مشرقی ممالک کی طرح تاتاریوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو گئے ہوتے۔ ابن تیمیہ نے اسلام کو بدعتوں سے پاک کیا اور لوگوں کے سامنے وہ خالص اسلام پیش کیا جسے لے کر مہبط وحی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم دنیا میں تشریف لائے تھے۔ یہ ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

## حالاتِ زندگی

زوالِ بغداد کے صرف پانچ سال بعد ۱۰ ربیع الاوّل ۶۶۱ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۲۶۳ء کو ابن تیمیہ حران میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام احمد، تقی الدین لقب اور ابوالعباس کنیت ہے۔ ان کے اباواجداد میں ایک شخص محمد بن خضر گزرے ہیں ان کی والدہ کا نام تیمیہ تھا جن کی علمیت کا شہرہ دور دور تک تھا۔ اسی قابلہ کے نام سے یہ خاندان مشہور ہوا۔ اسی بزرگ اور ذی علم خاتون کی برکت سے اس خاندان نے علم و حکمت میں بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اور درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا۔ ابن تیمیہ کے والد عبدالحلیم اور دادا عبدالسلام کا شمار اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ یہ دونوں حضرات خصوصاً علم حدیث میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور اس موضوع پر قابلِ قدر کتابیں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔

جب ابن تیمیہ نے اس دنیا میں قدم رکھا تو فتنۂ تاتار اپنے شباب پر تھا۔ ایران و عراق کی سرزمین کو ملیامیٹ کر دینے کے بعد تاتاریوں نے شام کی جانب رخ کیا اور ابن تیمیہ کی پرورش بڑے خطرناک دور میں ہوئی۔ ابھی ان کی عمر مشکل سے چھ سال کی ہوئی تھی کہ ان کے خاندان کو حران چھوڑ کر دمشق میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ دمشق آنے کے بعد ابن تیمیہ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ زمانے کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ قرآن مجید حفظ کیا اس کے بعد صرف و نحو، تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں۔ چار سال کے اندر ہی ان تمام علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ شامی اساتذہ سے انہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں حتیٰ کہ گیارہ سال کی طالب علمی کے بعد صرف سترہ سال کی عمر میں انہیں فتویٰ دینے کا مجاز قرار دے دیا گیا۔ اکیس سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تو مسند تدریس بھی ورثہ میں ملی۔ ان کے علم و فضل کے پیش نظر تیس سال سے بھی کم عمر میں انہیں قاضی القضاۃ کا معزز عہدہ پیش کیا گیا جسے انہوں نے شرفِ قبولیت نہ بخشا۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری اسلامی فقہ کی تاریخ میں عہد مناظرہ کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں حنبلیوں اور اشعریوں میں بالعموم مناظرے ہوا کرتے تھے۔ ابن تیمیہ کا تعلق حنبلی مکتبِ فکر سے تھا۔ اس لیے انہوں نے ربیع الاول ۶۹۸ھ میں حماۃ کے مقام پر ایک استفتاء کا جواب لکھا۔ جو العقیدۃ الحمویہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں متکلمین پر نہایت سخت اعتراض کیے گئے تھے۔ اور ان کے خیالات کی پُرزور تردید کی گئی تھی۔ یہی فتویٰ ابن تیمیہ کی مخالفت کا سبب بنا۔ انہیں فتویٰ دینے سے روک دیا گیا۔ اظہار عقائد کے لیے بار بار دمشق اور قاہرہ کے درباروں میں طلب کیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ برسوں کی قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ دمشق اور قاہرہ کے علاوہ کچھ دنوں وہ اسکندریہ میں بھی مقید رہے۔

امام صاحب صرف قلم اور زبان کے مرد میدان تھے بلکہ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ ان کے عنفوان شباب ہی میں ہلاکو کے بیٹے غازان نے شام پر حملہ کر دیا۔ سلطانِ مصر کو شکست ہوئی اور غازان حمص پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دمشق پر بھی قبضہ جمانے کے منصوبے باندھنے لگا۔ اہل دمشق کو جوں ہی غازان کے اس ارادے کا پتہ چلا دمشق میں لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ اس موقع پر ابن تیمیہ نے بڑی دلیری کا ثبوت دیا۔ وہ خود غازان کے پاس گئے اور باشندگانِ دمشق کے لیے امان نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیت المقدس کے وہ مسلمان جو تاتاریوں کی قید میں تھے انہیں بھی ابن تیمیہ نے غازان سے کہہ سن کر رہا کرا دیا۔ دمشق میں قیامِ امن کے سلسلے میں بھی انہوں نے نہایت شاندار کارنامے انجام دیئے۔ ساتویں صدی کے آخری سال دمشق پر تاتاریوں کے حملے کی افواہ ایک مرتبہ پھر پھیلی۔ اس مرتبہ ابن تیمیہ نے بجائے امان نامہ حاصل کرنے پر اکتفا کرنے کے ان دشمنانِ اسلام سے میدانِ جنگ میں مقابلہ کرنے کا عہد کر لیا۔ وہ ارکین دربار کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے مصر گئے جہاں انہوں نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کے سامنے جہاد کی ضرورت اور اس کی فضیلت پر کئی زوردار تقریریں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارکانِ حکومت کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے تاتاریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے بعد ابن تیمیہ دمشق آ گئے لیکن دو سال کے بعد جب دمشق پر حملہ ہوا تو سلطان مصر گھبرا گیا اور قریب تھا کہ شام و مصر کو تاتاریوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے کہ ابن تیمیہ ایک بار پھر قاہرہ گئے اور بادشاہ کی حوصلہ افزائی میں کامیاب ہو گئے۔ حتیٰ کہ معرکۂ شقحب میں مسلمانوں نے دشمنوں کا ایسا مقابلہ کیا کہ نوے ہزار تاتاری کام آئے۔ اس جنگ میں ابن تیمیہ نے ایک سرفروش مجاہد کی طرح شمشیر زنی کی۔

ابن تیمیہ نے اپنی تمام تر کوشش اس چیز پر صرف کی کہ مسلمان قرونِ اولیٰ کی طرف لوٹ جائیں۔ اور کتاب و سنت سے سرِ مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تمام فرقوں اور مکاتیبِ فکر کی زبردست مخالفت کی۔ وہ خارجی، مرجئی، معتزلی، جہمی، کرامی، اشعری وغیرہ کے شدید مخالف تھے اور ان کے عقائد کی تردید میں انہوں نے زبان اور قلم دونوں سے کام لیا۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن کریم کے لفظی معنیٰ مراد لیے جائیں اور آیات میں کسی قسم کی تاویل نہ کی جائے۔ حتیٰ کہ وہ تجسیمِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں۔ بدعات کے وہ زبردست مخالف ہیں۔ زیارتِ قبور کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیتے ہیں حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزارِ مقدس کی زیارت بھی ان کے نزدیک گناہ ہے۔ صوفیا، فلاسفہ اور متکلمین بھی ان کے اعتراضات کا نشانہ بنے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں بار بار قید کیا گیا۔ قید کے ایام میں وہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے۔ جب ارکانِ دربار میں سے کوئی ایسا شخص برسرِ اقتدار آتا جو ابن تیمیہ کا حامی ہوتا تو وہ رہا کر دیئے جاتے یا

حکومت کو ان کی خدمات کی ضرورت لاحق ہوتی تو وہ قید خانے سے باہر نکالے جاتے تھے۔ آخر میں جب انہوں نے ایک فتویٰ میں لکھا کہ صرف زیارت کے ارادے سے مدینہ منورہ کا سفر کرنا شرعاً ثابت نہیں ہے تو اس سے مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی۔ فقہا نے کفر کا فتویٰ دیا۔ شعبان ۷۲۶ھ میں وہ دمشق کے قلعے میں بند کر دیئے گئے۔ ابتداءً جملہ سامانِ آسائش فراہم کیا گیا حتیٰ کہ انہیں فتویٰ لکھنے کی بھی اجازت تھی جس کی وجہ سے ان کے حامیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا آخر کار حکومت کو حکم نافذ کرنا پڑا کہ ابن تیمیہ سے لکھنے کی تمام چیزیں لے لی جائیں۔ یہ سزا ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ آخری تحریر انہوں نے کوئلے سے لکھی کہ "مجھے اصل سزا دی گئی ہے تو صرف یہی ہے" اس کے بعد وہ جلد ہی بیمار پڑے اور بیس دن کی مختصر علالت کے بعد ۲۰ ذیقعد ۷۲۸ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۳۲۸ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ جنازے میں دو لاکھ سے بھی زیادہ اشخاص نے شرکت کی۔

## تصانیف

ابن تیمیہ نے کل ۶۶ سال کی عمر پائی جس کا بیشتر حصہ معلمی میں گزارا اور ایک طویل مدت تک تھوڑے تھوڑے وقفے سے قید خانے میں رہے۔ اس کے علاوہ جہاد میں بھی انہوں نے حصہ لیا۔ اس کے باوجود ان کی تصانیف کی تعداد پانسو بتلائی جاتی ہے۔ حافظ ذہبی تو ایک ہزار سے بھی اوپر بتلاتے ہیں۔ ابن تیمیہ کی تصانیف تقریباً تمام علوم متداولہ پر ہیں۔ جن میں تفسیر، حدیث، فقہ و اصول، فتاویٰ، ادب، نحو، لغت، منطق، ہیئت، جبر و مقابلہ، ریاضی اور سیاسیات شامل ہیں۔ ہمیں سر دست ان کی سیاسی تصانیف سے سروکار ہے۔ ان میں الامامۃ والسیاسۃ اور السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعایا نے بہت شہرت پائی۔ ان میں جہانبانی کے اصول بتلائے گئے ہیں۔ راعی اور رعایا کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امام اور اس کے فرائض زیر بحث آئے ہیں۔ شرعی حدود اور اسلامی حکومت کے میزانیہ کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ ان کے علاوہ اور قابلِ ذکر کتاب جو نیم سیاسی اور نیم مذہبی ہے وہ منہاج النبوۃ ہے۔ یہ کتاب دراصل شیعی عقائد کی تردید میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں جا بجا سیاسی اصول بیان کئے گئے ہیں بالخصوص خلافت کے متعلق تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

## اسلوب بیان اور طرزِ استدلال

ابن تیمیہ کی تصانیف میں جدت و انفرادیت کا غلبہ ہے۔ زبان عام طور پر سلیس اور عام فہم استعمال کی گئی ہے۔ لیکن جہاں مخالفین کے عقائد کی تردید کا موقع آتا ہے تو اندازِ بیان نہایت بلند ہو جاتا ہے اور وہ بلا تکلف دلیل پر دلیل اور ثبوت پر ثبوت دیتے چلے جاتے ہیں جو عقلی بھی ہوتے ہیں اور نقلی بھی جن

کے سامنے بڑے سے بڑے حریف کو سرِ تسلیم خم کرتے ہی بنتی ہے۔ کہیں کہیں طنز کا گہرا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

ابن تیمیہ نے ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ جس کی خاطر وہ شمشیر برہنہ لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑے اور جس کے لیے انہوں نے قلم اور زبان دونوں سے خوب خوب کام لیا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ مسلمان کتاب اللہ اور احادیث پر سختی کے ساتھ کاربند ہو جائیں اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو خیرباد کہہ دیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کے اثبات میں صرف کتاب وسنت پر اکتفا کیا ہے البتہ کہیں کہیں آثار صحابہ اور ممتاز سلاطین اسلام کے طریقوں سے بھی استدلال کیا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ اپنے نظریات کی بنیاد قرآن کریم ہی پر رکھتے ہیں۔ لیکن وہ آیاتِ قرآنی میں کسی قسم کی تاویل یا کھینچ تان کے قائل نہیں۔ لفظی معنی مراد لیتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنی کتاب سیاست شرعیہ میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ حکمران کو چاہیئے کہ صرف مستحق افراد کو عہدے دے اور کسی حالت میں بھی غیر مستحق لوگوں کو ترجیح نہ دے تو یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ یا ایھا الذین اٰمنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا امٰنٰتکم وانتم تعلمون ۔ (اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ ہی اپنی امانت میں خیانت کرو حالانکہ تم خیانت کی خرابیوں سے واقف ہو) یا جہاں وہ حاکم کے لیے مشورہ کی اہمیت واضح کرتے ہیں تو وہ فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر (یعنی ان کا قصور معاف کرو ان کے لیے استغفار کرو اور ان کو شریک مشورہ کر لیا کرو) پیش کرتے ہیں۔

ابن تیمیہ کبھی ضعیف احادیث سے استناد نہیں کرتے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ صحاح ستہ کی روایات ہی تک خود کو محدود رکھیں وہ شاذ و نادر ہی دیگر ذرائع سے مدد لیتے ہیں وہ بھی مسند امام حنبل سے آگے قدم نہیں بڑھاتے مثلاً ان کی رائے میں ارباب حل وعقد کے لیے نرمی اور خوش اخلاقی نہایت ضروری ہے تو صحیحین سے یہ روایات نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو آپؐ نے ان سے فرمایا "نرمی کرنا، سختی سے بچنا، لوگوں کا دل خوش کرنا، ان کی رضا جوئی کرنا، انہیں دشمن نہ بنانا" اس کے علاوہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تو صحابہ کو خشم آلود دیکھ کر آپ نے فرمایا "تم نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو سخت گیری کے لیے مبعوث نہیں ہوئے" وہ سلطان کی خیر خواہی رعایا کا فریضہ بتلاتے ہیں تو مسلم کی یہ روایت بطور سند پیش کرتے ہیں۔ کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین کاموں سے خوش ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ دوسرے یہ کہ سلسلۂ الٰہی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور متفرق نہ ہو۔ تیسرے اس فرمانروا کے

ہمدرد اور خیر خواہ رہو جس کو اللہ تعالیٰ تمہارا معاملہ سپرد کر دے۔" ابن تیمیہ مشتبہ روایات کو بطور ضرب الامثال کے پیش کرتے ہیں مثلاً السلطان ظل اللہ فی الارض یا یہ روایت کہ ظالم بادشاہ کے ماتحت ساٹھ سال گزارنا سلطان کے بغیر ایک رات رہنے سے اچھا ہے۔ ان روایات کی صحت کے باوجود ان کو مقولہ ہی کی حیثیت دیتے ہیں۔

اقوال و افعال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کرنے کے علاوہ ابن تیمیہ اجل صحابہ کے آثار سے بھی ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ بالخصوص خلفائے اربعہ کے اقوال و طرز عمل کو جا بجا اپنے نظریات کی توضیح کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں مثلاً جہاں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ مصلحت شرعی کے پیش نظر ایسے شخص کو بھی حاکم بنایا جا سکتا ہے جو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ فضیلت کا مالک نہ ہو تو وہ حضرت ابوبکر کے اس طرز عمل کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت خالدؓ کو متعدد فروگزاشتوں کے باوجود سپہ سالاری کے عہدے پر فائز رکھا اور انہیں معزول نہیں کیا۔ یا ابن تیمیہ جہاں محض دوستی یا قرابت کی بنا پر کسی شخص کے تقرر کی شدید مخالفت کرتے ہیں تو وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں "جو کوئی مسلمانوں کے کسی کام کا مالک ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت اور قرابت کی بنا پر کسی کو حاکم بنا دیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور مسلمانوں سے غداری کی۔" شرعی حدود کے اجراء میں کسی وجہ سے بھی لیت و لعل نہیں کرنی چاہیئے اس کے لیے حضرت عثمانؓ کا یہ قول پیش کرتے ہیں "جب حد شرعی تک نوبت آجائے تو اس وقت شفاعت کرنے والے اور شفاعت قبول کرنے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہو۔" یا جہاں وہ حکمران کو تاکید کرتے ہیں کہ عمال حکومت کے حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھیں تو وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وہ قول نقل کرتے ہیں جو کسی عامل کے ظلم کی اطلاع ملنے پر آپ فرمایا کرتے "الٰہی میں نے ہرگز ان کو یہ حکم نہیں دیا ہے کہ وہ تیری خلقت پر ظلم کریں۔"

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے علاوہ ابن تیمیہ تابعین کے اقوال سے بھی استدلال کرتے ہیں بالخصوص وہ اکثر مقامات پر عمر بن عبدالعزیز کے طرز عمل اور ائمہ اربعہ کی آراء کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا طرز استدلال کلیتہً شرعی ہے اس لیے تاریخ عالم کے واقعات کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں۔

ابن تیمیہ برمحل امثال سے بھی ثبوت کا کام نہایت عمدگی سے لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "اولی الامر کو عنان حکومت اس غرض سے سپرد کی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کو نیک کام کرنے کی ترغیب دے اور انہیں برائیوں سے روکے لیکن اگر وہ رشوت لے کر برائی اور معصیت کا باعث بنے تو وہ مقصود پر عمل پیرا ہونے کے بجائے اس کے

خلاف کام کرے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم نے کسی کو اس غرض سے نوکر رکھا کہ وہ دشمن کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا مگر اس نے الٹا دشمن کی مدد کر کے تمہیں ہی پیٹنا شروع کر دیا۔ یا وہ بمنزلہ اس شخص کے ہے جس نے اس غرض سے مال حاصل کیا کہ اس کے ذریعے وہ جہاد فی سبیل اللہ کرے لیکن وہ کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے بجائے الٹا مسلمانوں سے لڑنے لگا۔ وہ اقامت حدود کو مجرم کے لیے باعث رحمت قرار دیتے ہوئے یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ "طبیب مریض کو کڑوی دوا پلاتا ہے۔ بدن کے بدگوشت کو کاٹتا ہے۔ پچھنے لگواتا یا فصد کرا کے رگیں کٹواتا ہے بلکہ انسان خود بھی کڑوی دوائیں پیتا اور مشقت گوارا کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ راحت بدنی اور نفسی حاصل کرے۔"

# سیاسی نظریات

خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد جتنے بھی خاندان برسر اقتدار آئے وہ شرعی قوانین سے دور ہوتے چلے گئے۔ اور جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اس لیے ایسے سیاسی مفکرین جنہوں نے اسلامی قوانین پر اپنے نظریات کی بنیاد رکھی ان کے لیے سب سے زیادہ مشکل مرحلہ یہ درپیش تھا کہ قانون شرعی اور اپنے زمانے کے حالات میں مطابقت کس طرح پیدا کریں۔ یہی ایسا مقام ہے جہاں اکثر نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اور کچھ مفکرین اس خاردار میدان سے اس طرح دامن بچانے میں کامیاب ہوئے کہ انہوں نے اقتدار اعلیٰ کی صفات اور اس کے فرائض کی طویل فہرست مرتب کر دی اور ہم عصر حکمران جو ان صفات میں سے کسی ایک صفت کا بھی حامل نہیں اس کی برطرفی یا بحالی کے متعلق کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا۔ ابن تیمیہ جن کے سیاسی تصورات کلیتہً قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں ان کو بھی ہمعصر سیاسی حالات میں مطابقت پیدا کرنے کا کٹھن معاملہ پیش آیا تو انہوں نے ایک اور نئی راہ نکال لی وہ یہ کہ دیگر مفکرین کی طرح وہ حکمران کے اوصاف بھی نہیں بیان کرتے بلکہ وہ اپنی تمام توجہ شرعی احکامات کی تشریح و توضیح کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ ان کے سیاسی افکار کا محور یہ ہے کہ احکامات شرعیہ معاشرے کی اصلاح و تنظیم میں کس حد تک معاون ہیں۔ لیکن وہ اس بحث سے پہلو تہی کر جاتے ہیں کہ ہمعصر سیاست کا دینی احکامات سے کیا تعلق ہے اور اسے دینی بنانے کے لیے کیا کیا تبدیلیاں بروئے کار لانی چاہئیں۔

## انسانی طبقے

ابن تیمیہ نہ تو انسانی خصائص پر روشنی ڈالتے ہیں اور نہ ہی اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ اجتماع کیسے

کیسے وجود میں آیا۔ وہ نہ تو فارابی کی طرح معاہدۂ عمرانی پر عقیدہ رکھتے ہیں اور نہ ہی غزالی کے ہم خیال ہیں کہ اجتماع اقتضائے فطرتِ انسانی کا نتیجہ ہے۔ وہ تمام چیزوں کو ان کی موجودہ صورت میں تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کو اس سے سروکار نہیں کہ ابتداءً ان کی ساخت کیا تھی اور وہ کن کن ارتقائی مراحل سے گزری ہیں۔ وہ تمام انسانوں کو ہم جنس بتلاتے ہیں۔ ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز کے وہ شدید مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو اس بات کا خواہاں ہو کہ وہ دوسروں سے اعلیٰ اور ارفع ہو جائے اور لوگ اس کے دست نگر ہوں انسانیت کی توہین کا باعث ہے۔ اور پوری انسانیت کے ساتھ ظلم کرنے کا مرتکب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خود کو دوسروں سے برتر کرنے کی خواہش انسان کے کمینہ اور رذیل جذبات کی مظہر ہے۔ اس کے باوجود ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ مرتبہ میں انسان برابر ضرور ہیں لیکن صلاحیتوں میں ایک دوسرے میں زبردست فرق ہوتا ہے۔ تمام انسان ایک جیسی صلاحیت کے مالک نہیں ہوتے۔ لوگ عقل اور دین میں مختلف درجے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں قرآنی آیت پیش کرتے ہیں۔ هو الذی جعلکم خلئف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجت لیبلوکم فی ما اتکم (وہی خدا جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا تم میں ایک کو دوسرے پر فوقیت بخشی تاکہ اپنی عطا کردہ نعمتوں میں تمہیں آزمائے)۔ نیز یہ آیت نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیوٰة الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجت لیتخذ بعضهم بعضا سخریا (ہم نے ان کی روزی دنیاوی زندگی میں تقسیم کر دی ہے اور بعض کے درجے دوسروں سے بلند کر دیئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو خدمتگار بنا لیتا ہے۔

ابن تیمیہ کے نزدیک انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جو دوسروں پر غلبہ کے خواہاں ہیں۔ اور خدا کی زمین پر فساد کا بیج بوتے ہیں۔ یہ طبقہ ملوک اور رؤسائے مفسدین پر مشتمل ہے۔ اس گروہ کے افراد کی مثال وہ فرعون سے دیتے ہیں اور انہیں بدترین خلائق بتلاتے ہیں۔ دوسری قسم میں ایسے لوگ شامل ہیں جن کو کسی قسم کی فوقیت اور برتری تو حاصل نہیں لیکن وہ فساد برپا کرنے کا منصوبہ بناتے رہتے ہیں۔ اس گروہ میں چور اور دیگر جرائم پیشہ لوگ داخل ہیں۔ تیسرے گروہ میں ایسے لوگ شامل ہیں جو علو اور برتری کے خواہاں ضرور ہیں لیکن اس کے لیے فساد برپا کرنے کا قصد نہیں کرتے۔ اس گروہ میں وہ مذہبی رہنماؤں کو شامل کرتے ہیں جو دین کے ذریعہ برتری کے حصول کے متمنی ہیں۔ چوتھے اور آخری گروہ میں ایسے افراد داخل ہیں جو دوسروں سے افضل ہوتے ہوئے بھی روئے زمین پر نہ تو کسی قسم کی برتری کے خواہاں ہوتے ہیں اور نہ ہی فساد برپا کرنے کا قصد کرتے ہیں۔ یہی خیر البریہ کے لقب سے ملقب ہیں۔

## دین اور سیاست

ابن تیمیہ کے نزدیک دین اور سیاست دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی ان کے نزدیک محال ہے۔ ان کی رائے میں سیاست کا مقصد ہی تقرب الی اللہ اور اقامت دین ہے۔ اور جب لوگ تقرب الی اللہ کے جویاں ہوتے ہیں اور اقامت دین ان کا مطلوب و مقصود بن جاتا ہے تو لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مال اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کیا جانے لگتا ہے۔ جس کے باعث دین و دنیا کی فلاح و بہبود حاصل ہوتی ہے۔ وہ سیاست شرعیہ میں لکھتے ہیں " ولایت و حکمرانی کا لازمی مقصد خلق خدا کے دین کی اصلاح ہے۔ اگر لوگوں کا دین برباد ہو جائے تو یہ بے حد مہلک ہوگا اور مال کے اعتبار سے وہ دنیاوی نعمتیں ان کو کچھ فائدہ نہ دے سکیں گی جن سے منعم حقیقی نے نوازا ہے۔" اسی کتاب میں ایک اور جگہ اس طرح سے رقم طراز ہیں " اگر سلطنت دین سے محروم ہو یا دین حکومت کی پشت پناہی سے عاری ہو تو لوگوں کے احوال فاسد ہو جاتے ہیں۔" وہ اپنے زمانے کے خلفشار کی سب سے بڑی وجہ عمال حکومت کی حقیقت ایمان اور کمال دین سے محرومی کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین کی سیاست سے علاحدگی خواہ کسی صورت میں بھی ہو بنی نوع انسان کے لیے بے حد مضر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کبھی بھی دین اور سیاست میں جدائی ہوتی ہے دو گروہ معرض وجود میں آجاتے ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو دیندار تو ہوتے ہیں لیکن قوت حرب، جہاد اور مال سے، جن کا دین خداوندی محتاج ہے، دین کی تکمیل نہیں کر سکتے اور دوسرا گروہ ایسے والیان ریاست پر مشتمل ہوتا ہے جو مال اور حربی قوت کو بروئے کار تو لاتے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد اقامت دین نہیں ہوتا۔ ابن تیمیہ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے وہ نہایت واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ دونوں گروہ " مغضوب علیہم والضالین" ہیں۔ ان میں سے ایک بھی صالح کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ صلحائے امت میں صرف ایسے لوگوں کو داخل کیا جا سکتا ہے جو اپنے مقدور بھر حصول ولایت کے لیے جد و جہد کریں اور اس سے ان کی نیت یہ ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی ولایت کا والی بنا دے گا تو وہ اسی کی اطاعت کریں گے اور تا حد امکان اس کے دین کا بول بالا کریں گے۔ مسلمانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ رہیں گے۔ واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کرتے رہیں گے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ابن تیمیہ سیاست اور مذہب کو مختلف افراد کے سپرد کئے جانے کے حامی بھی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بھی اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ کہتے ہیں " اولوالامر دو ہیں اہل صاحبان اقتدار کے یہ دونوں طبقے جب درست رہیں تو عملداری کے تمام کل پرزے درست رہتے ہیں اور رعایا سکھ کی نیند سوتی ہے۔" وہ ان دونوں طبقوں میں اشتراک عمل پیدا کرنے کی خاطر دونوں کو تاکید کرتے ہیں کہ اپنے ہر ہر قول اور فعل میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پورا پورا اہتمام کریں بالخصوص حوادث مشکلہ میں وہ تلقین

کرتے ہیں کہ جس حد تک کتاب وسنت کا منشا پورا کرنا ممکن ہو وہاں تک دونوں کے لیے ان پر عمل پیرا ہونا واجب ہے۔

## امام

ابن تیمیہ اس امر سے بھی بحث کرتے ہیں کہ امام کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے۔ وہ سیاست شرعیہ میں لکھتے ہیں کہ "چونکہ انسانوں کو اپنی حاجات میں ایک دوسرے سے سابقہ پڑتا ہے اور اجتماع کے بغیر بنی آدم اپنی حاجتیں اور مصلحتیں پوری نہیں کر سکتا اس لیے ضروری ہے کہ اجتماع کی حالت میں ان پر کوئی حاکم وآمر ہو" ان کے نزدیک امور رعایا کا والی ونگران ہونا واجبات دین میں سے سب سے بڑا واجب ہے۔ اس وجوب کے وہ دو سبب بتلاتے ہیں اول یہ کہ جب تک کوئی حاکم وآمر نہ ہو تو نہ دین کا قیام وبقا ممکن ہے اور نہ ہی دنیا کی فلاح وبہبود حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ بطور دلیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی پیش کرتے ہیں کہ جب تین آدمی سفر کو نکلیں تو ان کو چاہیئے کہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنالیں۔ وجوب امام کا دوسرا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا دوسرے لفظوں میں تبلیغ کو واجب کر دیا ہے اور یہ فریضہ قوت وامارت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اسی طرح جہاد، عدل وانصاف، اقامت حج، جمعہ، عیدین، مظلوم کی امداد، اقامت حدود وبہت سے دوسرے فرائض وواجبات بھی قوت وامارت کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتے۔

## امام کا انتخاب

زوال بغداد کا اثر زندگی کے ہر ہر شعبہ پر پڑا بالخصوص افکار وسیاسیات بھی اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ اس زمانے کے مفکرین نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا جس کی عمدہ مثال ابن الطقطقی ہے۔ ابن تیمیہ اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق حقیقت پسند بھی ہیں اور حنبلی فرقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے شرعی قوانین سے سرمو انحراف کرنے پر بھی آمادہ نہیں۔ وہ شریعت کو امت مسلمہ یا اہل السنت والجماعت کے لیے اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں۔ بایں ہمہ اپنے زمانے کے سلاطین کو جائز حکمران سمجھتے ہیں۔ اور امت کے لیے ان کی اطاعت کو لازمی قرار دیتے ہیں تاکہ اصلاح دین ودنیا میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔ ان کو خلیفہ اور خلافت کے مسئلے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماوردی اور دیگر مفکرین کی طرح وہ خلیفہ کے اوصاف کی فہرست نہیں پیش کرتے۔ ان کے نزدیک امام کے انتخاب کا طریقہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امام کا تقرر اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے جو اجماع کے بے خطا طریقہ سے عمل میں آتا ہے۔ البتہ وہ امام کو شرعی احکامات کے شکنجے میں جکڑ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک امام خواہ کسی طریقے سے برسر اقتدار آیا ہو یا چند بنیادی صفات کے سوا نظری اوصاف کا بھی حامل نہ ہو لیکن وہ اصلاح دین ودنیا کی خاطر کتاب وسنت کے زریں اصول پر کاربند رہے تو امت کے لیے ایسا فرمانروا باعث رحمت ہے۔ لیکن ایسا حاکم جو شرعی طریقے پر منتخب

ہوا ہو اور معیاری اوصاف کے ساتھ متصف ہو لیکن امور مملکت کے چلانے میں شرعی حدود کی پابندی نہ کرے تو امت کے لیے ایسا شخص لعنت سے کم نہیں۔

## فرائض

ابن تیمیہ سربراہِ حکومت کے فرائض سے نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا فرض اس امانت کی نگہداشت ہے جو بطور حکومت اس کے سپرد ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ولایت اور حکومت ایک امانتِ الٰہی ہے جس کا ادا کرنا اس کے موقع و محل میں واجب ہے۔" وہ احادیث نبوی سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا "اے ابوذر امارت اور حکومت ایک امانتِ الٰہی ہے اور یہ قیامت کے دن حسرت و ندامت کا باعث ہوگی۔ سوائے اس شخص کے جس نے اس کو اس کے حق کے ساتھ قبول کیا۔ اور اس کے تمام حقوق ادا کرتا رہا۔" آپؐ نے ایک اور موقع پر فرمایا "کوئی شخص ایسا نہیں جس کو احکم الحاکمین نے کوئی حکمرانی بخشی ہو اور وہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو کہ رعیت سے خیانت کرتا رہا ہو اور خالص اور بے لوث خیر خواہی نہ کی ہو تو حق تعالیٰ اس پر قیامت کے دن جنّت کی خوشبو حرام کر دیگا۔"

## حقوق کا تحفظ

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ امانات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک امانت فی الولایت اور دوسری امانت فی الاموال۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الیٰ اھلھا و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا (اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے مالکوں کو ادا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے) میں جس امانت کا ذکر ہے وہ امانت فی الولایات ہے۔ وہ اس آیت کا شانِ نزول یہ بتلاتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد حضرت عباسؓ نے خانہ کعبہ کی کلید برداری کا عہدہ تفویض کئے جانے کی دربارِ رسالت میں درخواست کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب سابق کنجیاں بنو شیبہ ہی کے حوالے کر دیں۔ اس آیت اور اس کے شانِ نزول سے ابن تیمیہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمان اولی الامر پر سب سے بڑا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ اعمال مسلمین میں سے ہر عمل پر ایسے شخص کو عامل بنایا جائے جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ اہل ہو۔ اسی کو امانت فی الولایات کہتے ہیں۔ کسی اہل شخص کو نظر انداز کر کے نا اہلوں کو کوئی عہدہ دیئے جانے کو خیانت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ بطور ثبوت مستدرک حاکم سے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ جو شخص کسی کام کا والی ہو

اور اس نے یہ جانتے ہوئے کہ ایسا شخص بھی میسر آ سکتا ہے جو مسلمانوں کے حق میں اس سے زیادہ بہتر ہوگا اور کسی ایسے شخص کو حکومت دے دی تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور مومنوں سے خیانت کی۔" اس لیے ان کا کہنا ہے" والیِ حکومت پر واجب ہے کہ ولایتوں کے نائب، فوجی سردار، قلعوں کے محافظ، محکمۂ مال کے افسر، خراج اور زکوٰۃ وصول کرنے والے اور دوسرے عہدیدار ایسے لوگوں کو مقرر کرے جو ان خدمات کے لیے موزوں ترین ہوں اور والیِ حکومت کا یہ فرض ہے کہ ذمہ داری کا ہر عہدہ پُر کرنے کے لیے پوری سعی اور جستجو کرے تاکہ قابل سے قابل آدمی مہیا کیے جائیں۔" وہ تاکید کرتے ہیں کہ ایسے شخص کو جو کسی عہدہ کا متمنی ہو یا اس کے لیے درخواست کرے کبھی اسے وہ عہدہ نہ دیا جائے۔ مزید توضیح کے لیے ان وجوہات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی وجہ سے نااہلوں کو مستحقین پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ملکی یا قومی تعصب کے باعث اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل اور لائق افراد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور نااہلوں کو بڑے بڑے عہدے سونپ دیئے جاتے ہیں۔ دوسری وجہ رشوت ہوتی ہے کہ نااہل بڑی سے بڑی رقم دے کر عہدے خرید لیتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ سربراہ حکومت کے دل میں قابل و مستحق شخص کے خلاف کینہ و عداوت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کینہ کی وجہ سے اس کا حق دوسروں کو دے دیتا ہے۔

ان وجوہات کے بتلانے کے بعد ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی وجہ ہو اور ان کے علاوہ کسی اور سبب کی بنا پر قابل پر ناقابل کو جس والیِ حکومت نے ترجیح دی تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔ وہ اس امر کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں کہ امیر اپنے بیٹے کو دوسروں کے مقابلے میں ترجیح دے خواہ یہ ولایت کے سلسلے میں ہو یا اس کا تعلق اموال سے ہو۔ اگر ایسا کرے گا تو وہ خیانت کا مرتکب ہوگا۔ وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا واقعہ بیان کر کے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد کو خلافِ شرع ترجیح نہ دی جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے بیٹوں کو ہمیشہ ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے سے باز رکھا اور آخری وقت جب لوگوں کا اصرار بڑھا کہ اولاد کو مفلس و قلاش چھوڑ کر نہ جائیے تو انہوں نے لڑکوں کو بلا کر فرمایا کہ میں تمہیں تمہارے حق سے زیادہ ہرگز نہیں دے سکتا۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اس امانت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدائے غنی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرزندوں کو بہت آسودگی اور فارغ البالی بخشی۔ وہ اس واقعہ کے راوی کا قول نقل کرتے ہیں کہ" میں نے ان کے ایک صاحبزادے کو دیکھا کہ اس نے ایک مرتبہ جہاد فی سبیل اللہ میں سو گھوڑے پیش کیے تھے۔" مزید وضاحت کے لیے وہ دو بادشاہوں کی اولاد کا ذکر کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک کے بیٹوں کو ان کے جائز حق کے طور پر بیس بیس درہم بطور میراث ملے

تھے اور دوسرے کی اولاد کو ناجائز طور پر چھ چھ لاکھ اشرفیاں ترکے میں ملی تھیں۔ لیکن اتنی بڑی رقم کے باوجود ان شاہزادوں کا یہ حال ہوگیا کہ وہ نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے اور ان میں سے اکثر کو دریوزہ گری کرتے دیکھا گیا۔

ابن تیمیہ نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ سعی و کوشش کے باوجود کوئی موزوں آدمی دستیاب نہ ہو سکے تو بحالتِ مجبوری اسی قابلیت کے آدمی پر اکتفا کی جائے جو میسر ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جب فرمانروا نے اپنی طرف سے قابل ترین شخص کے حاصل کرنے کی پوری کوشش کی مگر ویسا موزوں شخص میسر نہ آسکا تو اس نے اپنی طرف سے حق امانت ادا کر دیا۔ اور وہ اپنے فریضہ سے عہدہ برا ہوا۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک عادل اور انصاف پسند ائمہ کے زمرے میں داخل ہو گیا کیونکہ قیامت کے دن ہر شخص سے اسی کی باز پرس ہوگی جس کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فاتقوا اللہ ما استطعتم۔ (اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جہاں تک تم سے ہو سکے) اور فرمایا۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ (اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا)"

## قیام عدل

ابن تیمیہ کے نزدیک اولی الامر کا ادائے امانت کے علاوہ دوسرا فریضہ قیام عدل ہے۔ انہوں نے عدل کی اہمیت بیان کرنے میں بہت زور بیان صرف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "انصاف ہی پر دنیا و دین کی فلاح کا دارو مدار ہے اور بغیر عدل کے فلاح دارین کا حصول ناممکن ہے۔" وہ اہمیتِ عدل کے لیے قرآن کریم اور احادیثِ نبوی سے دلائل دیتے ہیں۔ وہ قرآنی آیت لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ــ (ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیاں دے کر بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری ہے تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں) سے عدل کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ متعدد احادیث بھی پیش کرتے ہیں جن میں امام عادل کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے مثلاً "امام عادل جو رعایا پر انصاف سے حکومت کرتا ہے اس کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے" یا "اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب امام عادل اور سب سے زیادہ مبغوض ظالم حکمران ہے۔" ان احادیث کے علاوہ وہ ایک اور حدیث بیان کرتے ہیں جس میں امام عادل کو ان سات آدمیوں میں سے ایک بتلایا گیا ہے جو قیامت کے دن عرش کے سائے میں ہوں گے جب کہ اس سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔

ابن تیمیہ عادل حکومت کے لیے جسے وہ السیاست العدلیہ کا نام دیتے ہیں دو بنیادی اصول بتلاتے

ہیں اول یہ کہ ازروئے انصاف مقدمات کے فیصلے کرنا اور دوم یہ کہ اہل حقوق کا حق ادا کرنا۔

رعایا کے ساتھ صرف عادلانہ سلوک ہی کے لیے تاکید نہیں کرتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ امیر کو چاہیئے کہ رعایا کے ساتھ احسان اور حسن سلوک سے پیش آئے اور ان کے مفاد کو پیش نظر رکھے۔ وہ کہتے ہیں "رعایا کے حق میں حسن نیت اور ان سے احسان کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ وہ اس کام کو کرے جس کی رعایا خواہش مند ہو۔ اور اس کام کو ترک کر دے جسے رعایا پسند نہ کرتی ہو ..... بلکہ رعایا کے ساتھ احسان یہ ہے کہ حاکم اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جو انہیں دین و دنیا میں نفع دے۔ اگرچہ کوئی متنفس اس سلوک سے ناخوش ہی کیوں نہ ہو۔" تاہم وہ حاکم کو اس امر کی تاکید کرتے ہیں کہ ایسا کام جس میں رعایا کا دینی اور دنیوی فائدہ مضمر ہو لیکن وہ ناعاقبت اندیشی یا اور کسی وجہ سے پسند نہ کرتی ہو تو اس کے کرنے میں نہایت نرمی سے کام لے۔ وہ نرمی کی اہمیت کے متعلق متعدد احادیث نقل کرتے ہیں۔ ایک حدیث یہ ہے کہ "کوئی کام ایسا نہیں جس میں رفق و ملاطفت کو دخل ہو اور وہ اسے زینت نہ بخشے اور کوئی کام ایسا نہیں جو سختی سے ہم کنار ہو اور وہ اس کو عیب دار نہ کر دے" ان کے نزدیک نرم کلامی اور خوش گفتاری ایک حکمران کا بہت بڑا فرض ہے وہ کہتے ہیں "جب کسی سے تحکمانہ لہجہ میں گفتگو کی جائے تو اس سے اس کی دل آزاری ہوتی ہے اور اگر ایسا لب و لہجہ اور عمل اختیار کیا جائے جس سے اس کا دل خوش ہو تو یہ کامل درجہ کی سیاست ہے۔" اس کی وہ نہایت عمدہ مثال یہ دیتے ہیں کہ طبیب مریض کو کوئی ایسی خوش مزہ چیز دیتا ہے تاکہ اس کی مدد سے بدمزہ دوا کا حلق سے اتارنا آسان ہو جائے۔ نرمی کے ساتھ ساتھ وہ تالیف قلب پر بہت زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیام امن کے لیے تالیف قلب بہت ضروری ہے حتیٰ کہ مجرموں پر قابو پانے کے لیے بھی یہی نسخہ تجویز کرتے ہیں۔

## اوامر و نواہی

امام کا تیسرا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ابن تیمیہ اس کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "بندوں اور شہروں کی بھلائی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے وابستہ ہے کیونکہ معاش و معاد کی کامیابی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں ہے اور یہ اطاعت اس وقت تک انجام پذیر نہیں ہو سکتی جب تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کیا جائے۔" ان کا کہنا ہے کہ امیر کے فرائض منصبی میں اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ عوام کو اعمال صالحہ کی ترغیب دے اور بھلائی اور اطاعت کا طریقہ اختیار کرے اور اس کام میں لوگوں کو مدد دے اور جہاں تک ممکن ہو اس کی ترغیب دے اور اگر کوئی جماعت فرائض کی تارک اور محرمات ظاہرہ کی مرتکب ہو تو اس کے خلاف جنگ کرے یہاں تک کہ وہ نماز پنج گانہ کی پابندی کرنے لگیں، زکوٰۃ کی ادائیگی کریں، حج بیت اللہ کا

فریضہ ادا کرنے لگیں، نکاح محرمات، حرام خوری، مسلمانوں کی جان و مال میں دست درازی کرنے اور اس قسم کے دوسرے محرمات سے باز آجائیں۔

ابن تیمیہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرنے والوں کی دو قسمیں بتلاتے ہیں۔ ایک وہ جن کو سزا دینے پر والی امر پوری طرح قدرت رکھتا ہے اور دوسرے وہ جن کے خلاف جہاد کئے بغیر قابو نہ پایا جا سکے۔ پہلی قسم کی صرف حدود اللہ کے اجرا سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ وہ اجرائے حدود کی برکات و حسنات کا ذکر کرتے ہیں اور اس سلسلے میں احادیث پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حدود اللہ کے جاری کرنے سے اطاعتِ الٰہی ظہور پذیر ہوتی ہے اور معصیت کو زوال آجاتا ہے۔ جس کا نتیجہ فراخیِ رزق اور نصرتِ الٰہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کو نقل کرتے ہیں کہ "زمین پر ایک حد کا جاری کیا جانا اہل زمین کے لیے اس سے بہتر ہے کہ چالیس صبح تک بارانِ رحمت نازل ہوتا رہے۔"

ابن تیمیہ اس امر کے شدید مخالف ہیں کہ والی امر رشوت لے کر یا اور کسی وجہ سے حدِ شرعی کو ختم کر دے۔ اگر امیر حدِ شرعی کے بجائے مجرم سے جرمانہ وصول کر کے بیت المال میں جمع کر دے تو بھی ابن تیمیہ اس پر مہرِ جواز ثبت کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ ان کا کہنا ہے کہ "وہ مال جو حدود اللہ کی برطرفی کے لیے وصول کیا جائے قطعاً حرام ہے۔ اور جب کوئی والی الامر اس فعل کا مرتکب ہو تو وہ دو بہت بڑے فسادوں کو جمع کرے گا۔ ایک احکم الحاکمین عزاسمہ کی مقرر کردہ حد کا تعطل اور برطرفی اور دوسرا حرام خوری۔ پہلا کام ترکِ واجب ہے اور دوسرا فعل حرام۔" ایک اور موقع پر ایسے حاکم کو اس دلالہ سے تشبیہ دیتے ہیں جو فحش کاری کے لیے کسی مرد اور عورت میں ملاپ کرا دیتی ہے۔ وہ اسے "زوجہ لوط" بھی کہتے ہیں۔

حدود کے سلسلے میں ابن تیمیہ نہایت مفصل ہدایات دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حدود شرعیہ کا نفاذ اس وقت لازمی ہو جاتا ہے جب کہ معاملہ حاکم کے روبرو پیش ہو جائے۔ اس وقت معافی، سفارش یا ہبہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حد کو ٹال نہیں سکتے۔ اسی طرح مجرم کی توبہ کا اثر بھی حدود پر نہیں پڑتا۔ اس کے توبہ کرنے کے باوجود حدود جاری ہو کر رہیں گی۔ تاہم وہ کہتے ہیں کہ مجرم کی توبہ اس کے گناہ کے لیے کفارہ ضرور بن جائے گی۔

ابن تیمیہ معاونین جرائم کو بھی سزا دلانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مجرم حقیقی اور معاون میں کسی قسم کی تمیز نہیں کرتے۔ وہ ثبوت میں حضرت عمرؓ کے عمل کو پیش کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے محاربوں کے ربیہ کو بھی قتل کرایا تھا۔ (ربیہ غارتگروں کے اس پاسبان کو کہتے ہیں جو غارت گری کے وقت کسی بلند مقام پر چڑھ کر چاروں طرف آنے والوں کی دیکھ بھال کرتا ہے)۔ اس نقلی دلیل کے علاوہ مرتکب و معاون کو مساوی سزا

دیئے جانے کے لیے عقلی ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں کہ ساتھیوں کی امداد ہی کے ذریعہ ارتکاب جرم ممکن ہوتا ہے۔ اور وہ مجاہدین پر قیاس کرتے ہیں جس طرح کہ تمام مجاہدین خواہ جنگ میں بالفعل شریک ہوں یا نہ ہوں مالِ غنیمت میں برابر کے شریک ہوتے ہیں کیونکہ جنگ نہ کرنے والے بھی جنگ کرنے والوں کی مدد کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ کے نزدیک سلطان کے نائب یا رؤسا جو درپردہ یا علانیہ مجرموں سے ملے ہوئے ہوں یا پہلے سے ملے ہوئے نہ ہوں لیکن جب ان پر قابو پایا جائے تو مال میں حصہ دار بن کر شرعی حدود کو معطل کر دیں یا اسے اپنے یہاں پناہ دیں وہ بھی جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ اور مرتکب جرم کے برابر ہی سزا کے مستوجب ہیں۔

ابن تیمیہ جملہ حدودِ شرعیہ سے نہایت تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ انہوں نے قتل، رہزنی، چوری، زنا، اغلام، قذف (بہتان)، شراب خوری وغیرہ کی حدیں بیان کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈاکو اگر کسی کو قتل کر ڈالیں تو مقتول کے ورثا کو معاف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے اگر کسی نے دوسرے کو عداوت کی بنا پر یا اور کسی وجہ سے ہلاک کر دیا ہو تو مقتول کے اولیاء کو ہر طرح سے اختیار ہے چاہیں تو قاتل کی جان لیں یا معاف کر دیں یا خوں بہا لے کر چھوڑ دیں۔ وہ سلطان کے قتل کے متعلق فقہا کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "فقہا اس شخص کے بارے میں مختلف الرائے ہیں جو سلطانِ اسلام کی جان لے۔ جیسے امیر المؤمنین حضرت عثمان اور امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہما کو قتل کیا گیا تھا کیا ایسا شخص محاربین کے حکم میں ہے کہ لازماً قتل کیا جائے یا اس کا معاملہ مقتول کے ورثا کے ہاتھ میں ہوگا۔" وہ اگرچہ اس مسئلہ میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تاہم یہ کہہ کر کہ سلطان کے قتل میں فساد عام ہے گویا وہ ظاہر کرتے ہیں وہ بھی سلطان کے قاتل کو اس کے ورثا کے حوالہ نہ کئے جانے کے حامی ہیں۔

ابن تیمیہ ایسے جرائم جن کی سزائیں شریعت نے مقرر نہیں کیں والی حکومت کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ گناہ کی زیادتی اور کمی کے پیش نظر تعزیر کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر کسی گناہ کی طرف لوگوں کا عام میلان پایا جائے تو والیٔ حکومت عقوبت میں سختی کرے اور اگر وہ گناہ قلیل الوجود ہو تو تعزیر میں نرمی کرنی چاہیئے۔" پھر وہ عادی مجرمین کو زیادہ سزا دیئے جانے کے حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "اگر گناہ کے مرتکب فسق و فجور پر مصر ہوں تو حاکم کو چاہیئے کہ عقوبت زیادہ کرے اور اگر اس کا ارتکاب شاذ و نادر ہو تو تعزیر میں بھی کمی کر دینا چاہیئے۔" وہ تعزیر کی مختلف قسمیں بتلاتے ہیں جن میں وعظ اور سخت کلامی، زجر و توبیخ بھی شامل ہیں۔ وہ مقاطعہ اور ترکِ کلام کو بھی تعزیر بتلاتے ہیں۔ عامل کی معزولی اور اس سے اسلامی خدمات لینا بند کر دینا، قید و بند کی سزا اور تشہیر بھی تعزیر کی مختلف صورتیں ہیں۔ وہ والی حکومت کو تنبیہ کرتے ہیں کہ کسی حالت میں بھی تعزیر کو شرعی حدود کے مساوی

نہ ہونے دے۔

حدود کا نفاذ یا تعزیر کا اجراء پہلی قسم کے مجرمین کی اصلاح کے لیے کافی ہے۔ لیکن جہاں تک دوسری قسم کے نافرمانوں کا تعلق ہے ان کو زیر کرنے کے لیے ابن تیمیہ والی حکومت کو جہاد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ جہاد کا مقصد یہ بتلاتے ہیں کہ دین تمام کا تمام اللہ ہی کا ہو جائے اور کلمۃ اللہ بلند ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ دین دو ہی چیزوں کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ اول قرآن دوم تلوار۔ ان کے الفاظ میں " دین کا قیام 'کتاب ہادی' اور 'حدید ناصر (تلوار)' کے بغیر ممکن نہیں۔" وہ ہر اس شخص کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ دین پہنچی ہو اور اس نے دعوت پر لبیک نہ کہا ہو۔ وہ قرآن کریم کے لفظی مفہوم کے مطابق اس وقت تک جہاد کرنے کا حکم دیتے ہیں جب تک کہ فتنہ باقی رہے اور دین سب کا سب اللہ کا ہی نہ ہو جائے۔ اس شخص کے خلاف جہاد کرنے کو فرض سمجھتے ہیں جو کلمۃ اللہ کی سربلندی کی راہ میں حائل ہو۔ البتہ ایسے لوگوں کو قتل نہ کرنے کی تاکید کرتے ہیں جو جنگ میں حصہ نہیں لیتے مثلاً عورتیں، بچے، راہب، زیادہ معمر اشخاص اور آفت رسیدہ لوگ۔ لیکن یہ لوگ اگر زبان یا فعل سے جنگ کریں تو ان کے قتل کئے جانے پر جواز ثبت کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ جہاد اس وقت تک واجب نہیں جب تک اسلامی حکومت کو مقابلے کی پوری قوت حاصل نہ ہو جائے۔ ابن تیمیہ تارکِ فرائض کے خلاف بھی جہاد کرنے کے وجوب کا فتویٰ صادر کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ کی دلیل میں منکرین زکوٰۃ سے حضرت ابوبکرؓ کے جہاد کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ احادیث نبوی کی رو سے خارجیوں کی سرکوبی کرنے کا حکم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عنقریب ایک قوم ظاہر ہو گی جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزوں کو حقیر جانو گے۔ وہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔" ابن تیمیہ باخوفِ تردید کہتے ہیں کہ اس حدیث میں خارجیوں کی طرف اشارہ ہے۔

### حاکم کا طرزِ عمل

ان فرائض کے علاوہ ابن تیمیہ کے نزدیک والی امر پر ایک اور فریضہ عائد ہوتا ہے وہ یہ کہ کردار و اخلاق کے لحاظ سے وہ خود کو بلند رکھے۔ بالخصوص چند اخلاق کا پیدا کرنا اس کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ تکلیف و مشکلات کے موقعوں پر صبر سے کام لینا، غصہ پی جانا، لوگوں کو معاف کر دینا، ہوا و ہوس کی مخالفت، فخر اور غرور سے دست برداری۔ خاص خاص اوصاف ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابن تیمیہ انتخاب یا تقرر

کے وقت ان اوصاف کی موجودگی کو تو ضروری قرار نہیں دیتے لیکن عنانِ حکومت سنبھال لینے کے بعد اس پر یہ فرض عائد کر دیتے ہیں کہ ان خصائل کو وہ حاصل کرے۔ ان اوصاف میں سے جرأت اور سخاوت کی اہمیت کو وہ بار بار واضح کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "خلقِ خدا کی رعایت اور لوگوں کی سیاست عطا و بخشش اور عالی حوصلگی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کے بغیر دین و دنیا کی اصلاح بھی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو حکمران ان دونوں صفات سے متصف نہ ہو اس سے حکومت اور عملداری چھین کر دوسرے کے حوالہ کر دی جاتی ہے۔" ابن تیمیہ بخل کی شدید مذمت کرتے ہیں اور حکام میں بخل کے نقص کو برداشت کرنے کے لیے وہ آمادہ نظر نہیں آتے۔ اس سلسلے میں وہ متعدد قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہیں جن میں بخیلوں کے لیے عذابِ الٰہی کی وعید سنائی گئی ہے۔

ان اخلاق فاضلہ کے علاوہ ابن تیمیہ والیانِ حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ امورِ مملکت کی انجام دہی بغیر عونِ نصرتِ الٰہی کے ممکن نہیں۔ وہ اس کے حصول کے لیے تین طریقے تجویز کرتے ہیں۔ اولاً یہ کہ تمام کام خالصتہً لوجہ اللہ کیا جائے اور دعا وغیرہ کے التزام کے ساتھ خدا ہی پر توکل ہو اور نماز کی پابندی کی جائے۔ دوسرے یہ کہ خلقِ خدا کو نفع پہنچا کر ان کے ساتھ احسان کیا جائے اور مالِ زکوٰۃ سے ان کی دست گیری کی جائے اور تیسرے یہ کہ خلقِ خدا کی ایذاؤں اور دوسری مشکلات میں صبر و رضا کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

## عمالِ حکومت

ابن تیمیہ نے موزوں حکام کے تقرر پر بہت زیادہ زور بیان صرف کیا ہے۔ وہ صرف اس بات پر اکتفا نہیں کرتے کہ موزوں شخص ہی کو عہدے تفویض کئے جائیں بلکہ وہ موزوں افراد کے اوصاف سے بھی بحث کرتے ہیں۔ جن دو صفتوں کی طرف خصوصی توجہ دینے کی سفارش کرتے ہیں۔ وہ قوت اور امانت ہیں۔ ان صفات کی اہمیت وہ کلام اللہ سے ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے جب مدین پہنچے تو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے حضرت موسیٰؑ کو ملازم رکھنے کے لیے اپنے والد سے سفارش کی تو یہی دو صفتیں گنوائیں کہ یا ابت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی الامین (ابا ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ بہتر سے بہتر آدمی جو آپ نوکر رکھنا چاہیں مضبوط اور امانت دار ہونا چاہیئے)۔

ابن تیمیہ کو اس بات کا احساس ہے کہ ان دو صفات کا ایک شخص میں جمع ہونا دشوار ہے۔ اس کا حل وہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ عہدہ کے اعتبار سے جو صفت زیادہ ضروری ہے اس صفت کے حامل اشخاص کو دوسروں پر ترجیح دی جانی چاہیئے۔ وہ لکھتے ہیں "لوگوں میں قوت اور امانت کا جمع ہونا قلیل الوجود ہے .... یعنی ہر ولایت اور ہر محل میں وہی واجب ہے جو وہاں کے مطابق اور مناسب حال ہو اور جب دو شخص دیکھے جائیں ان میں

سے ایک تو امانت میں سب سے بڑھا ہوا ور دوسرا قوت میں سب سے فائق ہو تو وہاں اس شخص کو ترجیح دینی چاہیئے جو اس ولایت کے لیے زیادہ نفع بخش ہو اور اس میں لوگوں کے لیے کم سے کم ضرر کا احتمال ہو" لیکن ایسے عہدے جہاں دونوں صفتیں مساوی طور پر مطلوب ہوں وہاں ابن تیمیہ ایک کی جگہ دو عامل کے تقرر کی سفارش کرتے ہیں۔ مثلاً افسر خراج میں قوت اور امانت دونوں درکار ہوتے ہیں قوت نہ ہو تو خراج کی وصولی میں مشکلات پیش آئیں اور امانت نہ ہو تو وصول کردہ رقم بجائے عوام کے فائدے کے افسر خراج خود اپنے اوپر خرچ کر ڈالے گا۔ لیکن ان دونوں صفات سے متصف آدمی کے نہ مل سکنے کی صورت میں وہ کہتے ہیں "جب کوئی مصلحت ایک آدمی کے تقرر سے تکمیل پذیر نہ ہو تو ایک سے زیادہ آدمی متعین کئے جائیں"۔

عمال کے تقرر میں وہ نہایت دلچسپ مشورہ دیتے ہیں کہ سربراہ مملکت اپنے مزاج و عادات کے برعکس لوگوں کو منتخب کرے تاکہ ایک دوسرے کی کمی کو پورا کریں۔ وہ لکھتے ہیں "جب خلیفۃ المسلمین یا امیر حلیم الطبع اور نرم مزاج ہو تو نائب السلطنت ایسا ہونا چاہیئے جو شدت کی طرف مائل ہو اور جب سلطان المسلمین کے مزاج میں شدت اور غضب ہو تو اس کے نائب کو حلیم الطبع اور نرم دل ہونا مناسب ہے۔ تاکہ دونوں کے امتزاج سے اعتدال پیدا ہو جائے"۔ ابن تیمیہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نہایت عمدہ تاریخی مثال دیتے ہیں کہ "یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے خالد کو اپنا نائب بنایا اور یہ تو ہر شخص کو معلوم ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ کی طبیعت نہایت نرم تھی اور حضرت فاروق رضؓ نے خالد کو معزول کر کے حضرت ابوعبیدہؓ کو قائد افواج مقرر فرمایا کیونکہ خالدؓ حضرت عمرؓ کی طرح گرم مزاج تھے اور ابوعبیدہؓ کے مزاج میں امیر المومنین ابوبکر صدیقؓ کی طرح حلم و انکسار تھا" حضرت خالدؓ کی معزولی کی اس سے عمدہ اور کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔

امام ابن تیمیہ اس مشکل کا حل بھی بتلاتے ہیں کہ ایک عہدے کے لیے دو یا دو سے زائد ایسے اشخاص ہوں جن کی صفات برابر درجے کی ہوں تو ان میں سے کس کو ترجیح دینی چاہیئے۔ وہ ایسی صورت میں بھی کسی ایک کے انتخاب کا حق والی امر کو نہیں دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے میں امیر کی ذاتی پسند اور ناپسند کو زیادہ دخل حاصل ہو جائے گا۔ اس کے لیے وہ قرعہ اندازی کا طریقہ تجویز کرتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں کہ قرعہ اندازی خلافِ اسلام نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ "اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ اذان دینے اور صفِ اول میں نماز پڑھنے کا کتنا بڑا درجہ ہے تو ہر شخص اذان دینے اور صفِ اول میں نماز پڑھنے کی کوشش کرے۔ اور قرعہ اندازی کے بغیر ان سے باز رہنا گوارا نہ کرے"۔ ابن تیمیہ مزید کہتے ہیں کہ صحابہ نے مسائل کو قرعہ کے ذریعہ حل کیا ہے۔ وہ جنگِ قادسیہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ لشکرِ اسلام میں اذان کی بابت نزاع

ہوگئی۔ ہر شخص اذان دینے کا خواہاں تھا۔ آخر کار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو مسلمانوں کے کمانڈر تھے قرعہ ڈال کر اس کا فیصلہ کیا۔

ابن تیمیہ عمال حکومت میں چند مثبت صفات کے علاوہ چند منفی خوبیوں کے بھی خواہاں ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم ان کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی عامل شرابی نہ ہو۔ وہ شرابی عمال کی معزولی کی تاکید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے تو ایک عامل کو صرف شراب کی تعریف میں شعر کہنے کی بنا پر برخاست کر دیا تھا۔ وہ عمالِ حکومت کو تحفے تحائف قبول کرنے سے بھی منع کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "اللہ تعالیٰ نے حکام پر رعایا کے قضائے حوائج کو واجب کر دیا ہے۔ لیکن وہ رعایا کی مشکلات دور کرنے اور حاجات بر لانے کے بجائے الٹا اس سے ہدیے اور نذرانے وصول کریں تو آخرت کے بدلے دنیا کے خریدار ہوں گے۔"

## سپہ سالار

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ابن تیمیہ حکام میں دو بنیادی صفات کے خواہاں ہیں اول امانت اور دوم قوت۔ لیکن وہ عہدہ اور فرائض کے مطابق کسی ایک صفت میں کمی ہونے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ سپہ سالار کے لیے امانت سے زیادہ قوت پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوت سے مراد "شجاعتِ قلب، لڑائی کی مہارت اور جنگی حیلہ سازی اور فریب کاری" ہے۔ ان کے علاوہ تیر اندازی اور شہسواری کو بھی سپہ سالار کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے وہ فاسق و فاجر کو بھی سپہ سالار مقرر کئے جانے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ ایسے امین اور متقی پر جو کہ ضعیف اور درماندہ ہو قوی فاسق و فاجر کو ترجیح دیتے ہیں اور اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل کرتے ہیں کہ جب ان سے پوچھا گیا فاجر قوی اور صالح ضعیف میں کس کو قائد افواج بنانا چاہیئے تو انہوں نے جواب دیا فاجر قوی کو۔ کیونکہ اس کی قوت کا فائدہ مسلمانوں کے لیے ہے اور اس میں جو فسق و فجور ہے وہ صرف اس کی ذات کے لیے ضرر رساں ہے۔ اور صالح ضعیف کا صلاح و تقویٰ گو اس کی ذات کے لیے منفعت بخش ہے لیکن مسلمانوں کے لیے اس کا ضعف ہلاکت آفریں ہے۔ ابن تیمیہ ایک اور دلیل دیتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو بہت بعد میں اسلام لانے کے باوجود امیر لشکر مقرر فرمایا اگرچہ حضرت خالدؓ سے ایسی حرکات سرزد ہوتی رہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر شاق گزرتی تھیں۔ برخلاف اس کے سرورِ کائنات نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو امارت اور ولایت قبول کرنے سے منع فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوذر اگرچہ صدق و امانت میں بڑے ممتاز درجے کے مالک تھے۔ لیکن ان میں قوت کی بڑی کمی تھی۔

ابن تیمیہ سربراہ مملکت کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ مصلحتاً کسی کم درجے کے شخص کو سپہ سالار مقرر کر دے اگرچہ اس کی ماتحتی میں اس سے بلند مرتبے کے لوگ ہوں۔ اس کا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ حضرت اسامہؓ شام کی مہم میں سپہ سالار نامزد کیئے گئے حالانکہ زیر کمان جلیل القدر صحابہ تھے۔

## قاضی

ابن تیمیہ قاضیوں کے انتخاب میں بے حد احتیاط برتنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قاضی کا دائرہ نہایت وسیع ہے وہ کہتے ہیں " قاضی اسی کو نہیں کہتے جو عدالت کی کرسی پر بیٹھا ہو بلکہ قاضی ہر وہ شخص ہے جو دو آدمیوں کے تنازع کا فیصلہ کرے خواہ خلیفہ و سلطان ہو یا ان کا نائب ہو یا والی ہو یا شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے متعین و مامور ہو۔ حتیٰ کہ وہ شخص بھی اس میں داخل ہے جو دو بچوں کی کسی منازعت کا فیصلہ کرے۔"

ابن تیمیہ قاضی میں بھی ان ہی دو اوصاف — قوت و امانت — کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن قاضی کے سلسلہ میں وہ قوت کا مفہوم قدرے مختلف بتاتے ہیں۔ قاضی میں ان کے نزدیک محاکمہ کی قوت ہونی چاہیئے جو علم اور جرأت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان کے نزدیک قاضی کی علمیت کا معیار یہ ہے کہ وہ اس عدل و انصاف سے واقف ہو جس پر کتاب و سنت دلالت کرتی ہے۔ اور جرأت قاضی میں اتنی ضروری ہے کہ کتاب و سنت کے مطابق فیصلے نافذ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے۔ وہ قاضی میں امانت کی صفت کی تشریح کرتے ہیں کہ قاضی میں خوف و خشیت الٰہی موجود ہو تاکہ وہ رشوت لے کر شرع کے احکامات کے خلاف فیصلہ نہ کرے اور خدا کے خوف کے باعث انسانوں کا ڈر اس کے دل سے بالکل نکل جائے۔ وہ اپنے اس بیان کی توثیق آیت کریمہ سے کرتے ہیں۔ لا تخشوا الناس واخشون ولا تشتروا بآیٰتی ثمنًا قلیلا ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکٰفرون۔ (تم لوگوں سے نہ ڈرو اور میری آیتوں کو حقیر رقم کے عوض نہ بیچو۔ جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں) وہ حدیث نبوی سے اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ " قضاۃ تین ہیں دو جہنم کا ایندھن بنیں گے اور ایک قاضی جنت میں جائے گا۔ پس جس شخص نے حق کو جانتے ہوئے اس کے خلاف فیصلہ کیا وہ جہنمی ہے اور جس نے علم و یقین حاصل کیئے بغیر بے خبری میں فیصلہ کر دیا وہ بھی جہنم میں جائے گا اور جس نے حق کو جان لیا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنت میں داخل کیا جائے گا۔"

ابن تیمیہ عہدہ قضا کے لیے عالم اور متقی کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک شخص میں علم و تقویٰ کی صفات

جمع نہ ہوں تو حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر عالم کے ہوائے نفس میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو متقی غیر عالم کو ترجیح دینی چاہیئے لیکن علمی تحقیقات کی ضرورت زیادہ ہو تو عالم جیسا بھی ہے متقی کے مقابلہ پر قابل ترجیح ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ حالات زمانہ کے مطابق قضاۃ کا تقرر عمل میں آنا چاہیئے۔ اگر زمانہ ایسا ہو کہ قاضی کو امیر لشکر اور عوام کی تائید حاصل ہو تو ضعیف عالم و متقی کو قوی پر ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر قاضی کو فوج و عوام کی حمایت حاصل نہ ہو تو ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں قاضی کا ذی قدرت ہونا لازمی ہے۔

## افسر خراج

وہ عمال خراج کے لیے بھی وہی دو صفتیں ضروری بتلاتے ہیں تاکہ قوت کے ذریعہ مالیہ وصول کر سکے اور امانت کے باعث خزانہ میں خرد برد نہ کرے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اگر ان دونوں صفتوں کے حامل اشخاص دستیاب نہ ہوں تو ابن تیمیہ ایک سے زائد افراد کے تقرر کی سفارش کرتے ہیں جن میں مجموعی طور پر یہ دونوں صفات موجود ہوں۔ تاکہ اشتراک عمل سے کاروبار مملکت میں اشتراک پیدا ہو جائے۔ ابن تیمیہ یہ نہیں بتلاتے کہ ان مختلف صفتوں کے افراد میں اتحاد عمل کیسے ممکن ہے۔

## راعی اور رعایا کے تعلقات

ابن تیمیہ مذہبی فرائض کی بجا آوری پر بہت زور دیتے ہیں۔ وہ راعی اور رعایا دونوں کو اسی بات کی تاکید کرتے ہیں کہ شریعت کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کریں اور اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہ رکھیں۔ وہ قیام امن کو اہم ترین بتلاتے ہیں جس کے بغیر اخروی فلاح کا حصول بھی محال ہے۔ اس لیے وہ عوام کو مشورہ دیتے ہیں کہ امن و امان کی خاطر ہر قسم کے فرمانرواؤں کی اطاعت کریں خواہ وہ قانونی طور پر برسر اقتدار آئے ہوں یا ناجائز ذرائع سے انہوں نے حکومت حاصل کی ہو۔ اگر وہ معصیت الٰہی کا حکم دیں تو اس حکم کا ماننا رعایا پر فرض نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ بغاوت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

رعایا کے لیے وہ اطاعت کے علاوہ والی حکومت کی خیر خواہی کو ضروری بتلاتے ہیں اور اسے مذہبی فرائض میں شمار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "ہمارے فرائض میں یہ فریضۂ الٰہی بھی داخل ہے کہ ہم والیان ریاست کے حامی و ناصر رہیں۔" وہ اس کے ثبوت میں حدیث نقل کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا انحصار تین چیزوں پر بتلایا گیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے "اپنے والیان حکومت کے خیر خواہ رہو جو تم

پر حکمران ہیں۔" ابن تیمیہ ظالم حکام کے حقوق کی ادائیگی کا بھی رعایا کو حکم دیتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی نقل کرتے ہیں کہ " ان کے حقوق ادا کرو اللہ تعالیٰ ان سے اس سلوک کے متعلق خود باز پرس کر لے گا جو انہوں نے رعایا کے ساتھ کیا ہوگا۔"

راعی پر رعایا کے حقوق ابن تیمیہ کے نزدیک ادائے امانت اور قیامِ عدل ہیں۔ وہ سورۂ نساء کی آیت پیش کرتے ہیں ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹا دو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اللہ تعالیٰ تم کو اچھی نصیحت کرتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے" اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں راعی پر رعایا کے حقوق کی نشاندہی کی گئی ہے کہ فرمانرواؤں کو رعایا کی جان و مال کا امین بنایا گیا ہے اس لیے ان کو چاہیئے کہ رعایا کی امانتیں ان کے حوالے کر دیں اور دوسرے یہ کہ جب لوگوں کے نزاعوں کا فیصلہ کریں تو عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اس کے بعد کی آیت میں رعایا کے فرائض بتلائے گئے ہیں کہ یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ذالک خیر واحسن تاویلا "اے ایمان والو اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔ اگر جھگڑا ہو جائے تمہارے درمیان تو تم اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر تم واقعی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے"

ابن تیمیہ راعی اور رعایا دونوں کو خاص طور پر مالی حقوق کی ادائیگی کی تاکید کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "حکومت اور رعایا دونوں پر واجب ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں۔ سلطان اور اس کے نائب تمام اہلِ حقوق کے عطیئے ان کو تفویض کر دیں۔ اسی طرح افسر مال اور خزانچی کو لازم ہے کہ جو کچھ سلطان کا حق مقرر ہے اسے پائی پائی ادا کر دیں اور رعایا کا فرض ہے کہ وہ افسر مال سے کوئی ایسی چیز طلب نہ کریں جس کے وہ حقدار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حاکم و محکوم میں جو بھی دوسرے کی حق تلفی کرے وہ ظالم ہے۔ وہ لکھتے ہیں "بسا اوقات حکام اور رعایا ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں حکام وہ وصول کرتے ہیں جس کا لینا ان کے لیے حلال نہیں۔ اور رعیت اس رقم کے دینے سے انکار کرتی ہے جس کا ادا کرنا اس پر واجب ہوتا ہے۔" صرف مالیات نہیں بلکہ فوجداری کے معاملات میں حق تلفی ہوتی ہے۔ حکام کبھی لوگوں کو ایسے معاملات میں سزا دیتے ہیں جن میں سزا دینا جائز نہیں اور ایسی سزائیں معاف کر دیتے ہیں جن کا جاری ہونا واجب ہوتا ہے۔

رعایا کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے وہ سفارش کا طریقہ تجویز کرتے ہیں تاکہ حکام کو رعایا کی ضروریات کا علم ہو اور راعی اور رعایا کے تعلقات ہمدردانہ نوعیت کے ہوں۔ وہ ارشاد نبوی کا حوالہ دیتے ہیں کہ "جو لوگ مجھ تک اپنی حاجتیں پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتے ان کی حاجتیں اور ضرورتیں میرے سامنے پیش کیا کرو اور جو کوئی غیر مستطیع اہل حاجات کی ضروریات حکام تک پہنچائے گا اللہ تعالیٰ اس کے قدم پل صراط پر اس دن جبکہ لوگوں کے قدم لڑکھڑاتے ہوں گے ثابت و قائم رکھے گا۔"

## مالیات

ابن تیمیہ والیان حکومت کو انہی محصولات کی وصولی کی اجازت دیتے ہیں جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں یعنی زکوٰۃ۔ مال غنیمت اور فے۔ اور ان میں سے ہر مد کی وہ توضیح بھی کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کا نصاب اور وہ چیزیں جس پر زکوٰۃ لی جائے ان سے ابن تیمیہ بحث نہیں کرتے۔ البتہ مستحقین زکوٰۃ کی وہ تفصیل بیان کرتے ہیں جن کا ذکر سورۂ توبہ میں آیا ہے۔ قوی اور روزی کمانے کی طاقت رکھنے والوں کو وہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں بتلاتے۔ غالباً اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی جو روزی کما سکتے ہوں اور روزی حاصل کرنے کے مواقع بھی ان کو میسر ہوں لیکن اس کے باوجود وہ ہاتھ پیر نہ ہلائیں تو ان کو زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے۔ مقروض کے بارے میں ابن تیمیہ کی رائے ہے کہ بقدر قرض زکوٰۃ کی مد سے اس قرض کا ادا کر دینا جائز ہے۔ بشرطیکہ یہ قرض کسی گناہ یا عیاشی کے باعث نہ ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہو تو زکوٰۃ کی مد سے اس کی ادائیگی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ مقروض ان معاصی سے تائب نہ ہو جائے جن کی وجہ سے وہ قرضدار ہو گیا ہے۔ وہ فی سبیل اللہ کے تحت نادار مجاہدین کی خوراک اور ان کے لیے اسلحات کا انتظام کرنے کے علاوہ حج فی سبیل اللہ کو بھی داخل کرتے ہیں۔

مال غنیمت جس کو عربی میں انفال کہتے ہیں ابن تیمیہ اس سے کما حقہ بحث کرتے ہیں۔ ابتداءً انفال کی لفظی تشریح کرنے کے بعد سورۂ انفال کی ان آیات کا انہوں نے حوالہ دیا ہے جن میں مال غنیمت کے متعلق رہنمائی کی گئی ہے۔ وہ مال غنیمت کے مصارف جو قرآن مجید میں مذکور ہیں بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں بتلاتے کہ اس آیت میں جو پانچ مستحقین خمس کا ذکر ہوا ہے آیا ان میں سے ہر ایک کو مساوی حصہ ملنا چاہیئے یا کسی کو کم یا زیادہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ یا دو ایک کو دے کر باقیماندہ مستحقین کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بقیہ مال غنیمت کے چار حصوں کو لشکر میں تقسیم کیے جانے کا حکم دیا ہے۔ تمام شریک جنگ افراد کو مساوی حصہ دینے کی وہ تاکید کرتے ہیں خواہ بالفعل وہ مقابلہ میں شریک بھی ہوئے ہوں یا نہیں۔ وہ نسب

یا فضیلت کی بنا پر کسی کو زیادہ حصہ دیئے جانے کے شدید مخالف ہیں۔ وہ عہد رسالت کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے کسی صاحب فضیلت شخص کو کم حیثیت آدمی پر ترجیح دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یاد رکھو تم لوگوں کو اپنے ضعیفوں اور مفلوک الحال لوگوں کی بدولت رزق دیا جاتا ہے اور انہیں کے طفیل تمہیں مدد دی جاتی ہے۔" البتہ وہ سپہ سالار کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ کسی مجاہد کی عمدہ کارکردگی کے صلہ میں انعام دے سکتا ہے اور بغیر شرط یا پہلے سے اعلان کے، خمس ہی میں سے شروع میں چوتھائی مال زیادہ دے سکتا ہے۔ اور واپسی پر تہائی مال مزید عطا کر سکتا ہے بشرطیکہ ایسا کرنے میں ہوائے نفس کو دخل نہ ہو بلکہ مصلحت شرعیہ پیش نظر ہو۔ ربع اور ثلث سے زیادہ انعام صرف اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب کہ شرط عائد کر دی جائے اور کسی معینہ کارنمایاں پر دیا جائے۔
ابن تیمیہ کے نزدیک پیدل کو مال غنیمت میں سے ایک حصہ اور سوار کو تین حصے دیئے جانے چاہئیں۔ وہ ان فقہا سے اتفاق نہیں کرتے جو سواروں کو صرف دو حصے دلانا چاہتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں عقلی اور نقلی دو قسم کے دلائل دیتے ہیں۔ اول یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے بعد سواروں کو تین حصے دیئے مزید برآں سوار کو نہ صرف اپنی ذات پر خرچ کرنا ہوتا ہے بلکہ اس کے ذمے سائیس کا بھی خرچ ہے۔ اور دو آدمیوں سے اتنی منفعت نہیں پہنچ سکتی جس قدر ایک گھوڑے سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ لفظ فے کے لغوی معنی اور وجہ تسمیہ سے بحث کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فے کے معنی لوٹا دینے کے ہیں۔ فے ایسا مال جو اللہ تعالیٰ کافروں کی طرف سے مومنوں کو لوٹا دے۔ وہ کہتے ہیں کہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ نے زر و مال اپنے بندوں کی اعانت کے لیے بنایا ہے اور اس انعام کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور کفار نہ تو خود اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی مومن بندوں پر جو اللہ کے عبادت گزار ہیں خرچ کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کافروں کا مال مومنوں کو لوٹا دیتا ہے۔ اصطلاح میں فے اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے جنگ کئے بغیر حاصل ہوا ہو۔

ابن تیمیہ فے میں جزیہ، رقم مصالحت، غیر مسلم حکومت کے تحفے، حربی تاجروں کے تجارتی مال پر دسواں حصہ یا ذمی تجار پر بیسواں حصہ تجارتی ٹیکس وغیرہ کو شامل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ نقض عہد کی وجہ سے کفار سے وصول کردہ جرمانے، لاوارث مال، اموال مغصوبہ بھی ان کے نزدیک فے ہی کی قسمیں ہیں۔
وہ فے کی رقم کو مصالح امت پر خرچ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن مصالح میں بھی تقسیم کا آغاز اہم جماعت سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اہم ترین جماعت اسلامی لشکر ہے۔ لشکر دوسرے لوگوں کے مقابلے

میں فے کا زیادہ مستحق ہے کیونکہ مال غنیمت یا فے اسلامی لشکر کے طفیل ملتا ہے۔ اس کے بعد عمال حکومت قضاۃ۔ علماء، محصلین زکوٰۃ، ائمہ مساجد اور موذن وغیرہ فے کے حق دار ہیں۔ ان مصارف کے علاوہ وہ فے کا مصرف یہ بتلاتے ہیں کہ مفاد عامہ پر خرچ کیا جائے۔ مثلاً اسلحات جنگ کے خریدنے، سرحدوں پر قلعوں کے بنوانے یا پل، نہر اور سڑک کی تعمیر وغیرہ میں۔ مساکین کو دیگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ ابن تیمیہ تالیف قلب کے لیے فے کی رقم خرچ کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری بتلاتے ہیں۔ وہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کہتے ہیں کہ آپؐ نے سرداروں کی تالیف قلب کے لیے فے میں سے عطیات دیئے۔ وہ اس کی متعدد مثالیں بھی دیتے ہیں۔ ابن تیمیہ غیر مسلموں کی تالیف قلب کے لیے روپیہ دیئے جانے کو جائز کہتے ہیں جس کا مقصد ان کی وحشت کو دور کرنا یا خود کو ان کے نقصانات سے محفوظ رکھنا ہے بشرطیکہ اس کے سوا اور کوئی صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ وہ نہایت واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ تالیف قلب میں روپیہ خرچ کرنے اور ملوک وروٴسا کی داد و دہش میں جس میں مستحقین کی حق تلفی کر کے غیر مستحقین کو دیا جاتا ہے صرف نیت کا فرق ہے اسی لیے والی الامر کو تاکید کرتے ہیں کہ تالیف قلب میں صرف کرنے کا مقصد توحید دین کی کوئی مصلحت ہونی چاہیئے۔

## شوریٰ

ابن تیمیہ سربراہ مملکت اور اس کے ماتحت عملے سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیشہ کتاب اور سنت کی روشنی میں کام کریں۔ لیکن اگر کسی خاص مسئلہ میں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ حکم خداوندی یا تعلیمات نبوی کیا ہیں یا کسی خاص حکم کو کس طرح عملی جامہ پہنانا چاہیئے تو سربراہ مملکت اور اس کے عمال حکومت کا فرض ہے کہ علماء سے مشورہ کریں تاکہ وہ آیات کریمہ کی توضیح کریں اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتلائیں۔ وہ شوریٰ کے متعلق آیات واحادیث کا حوالہ دیتے ہیں۔ اسی طرح جن معاملات میں کتاب وسنت خاموش ہیں ان میں سربراہ مملکت کو ایسے لوگوں سے مشورہ لینا چاہیئے جو کتاب، سنت اور اجماع امت سے بخوبی واقف ہوں۔ ان کے علاوہ کسی اور سے اسے مشورہ نہ کرنا چاہیئے۔ خواہ دینی یا دنیوی اعتبار سے کتنے ہی بلند کیوں نہ ہو۔ البتہ کسی معاملے میں علما کا اختلاف ہو تو ابن تیمیہ والی امر کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ تمام آراء کو بغور وخوض سنے اور اس رائے پر عمل کرے جو اس کے خیال میں کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہو۔

ان خیالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ ابن تیمیہ ماوردی کے برخلاف امام میں اجتہادی صلاحیت کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس معاملے میں غزالی کے ہم خیال ہیں کہ امام علماء کی تقلید کرے۔ تاہم وہ امام میں صائب رائے کو ضروری سمجھتے ہیں تاکہ علماء کے باہمی اختلاف کی صورت میں ایسی رائے کو ترجیح دے سکے جو کتاب و سنت کی روح سے قریب تر ہو۔